پندرہ روزہ

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

علیگ

• علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کے لئے ادارہ ذمہ دار ہے۔
• ہر مہینے کی ۱۰ اور ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

سششماہی ایک روپیہ
فی پرچہ ۲ر

جلد ۱ | ۱۰ دسمبر ۱۹۵۶ء | نمبر ۷

اجتماعی کردار

اقبال نے کہا تھا: "ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم"
زندگی عبارت ہے مقاصد کی تخلیق سے اور اس زندگی میں تابناکی آتی ہے ایک بیتاب تمنا سے، ایک بےچین لگن سے، ایک مضطرب آرزو سے، ان مقاصد کو پانے کیلئے جو کسی نے اپنے لئے خود تخلیق کئے ہیں۔ بلند مقاصد کی تخلیق، انکی جستجو اور تلاش اور پھر ان کے حصول کیلئے انتھک جد و جہد کتنا بوجھل کام ہے لیکن کیسا حسین، دلآویز اور شاندار کام۔ یہ نہ ہو تو انسان اور جانور میں فرق ہی کیا ہے۔ مقصد پست بھی ہو سکتا ہے بلند بھی۔ انکی بلندی اور پستی میں تمیز آپ کا کام ہے۔ ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے "بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے"۔ اور یہ مطمح نظر اکبر الہ آبادی کے زمانے تک محدود نہ تھا آج بھی خود اس عظیم تہذیبی روایات کے حامل تعلیمی شہر میں آپکو اس ذہنیت کے کتنے ہی نوجوان مل جائیں گے جن کی معراج تین چار سو روپیہ ماہانہ پر جاکر ختم ہو جاتی ہے جن کے دل اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے علاوہ کسی کی محبت کا جذبہ لئے کبھی نہیں دھڑکتے۔ دنیا انکے نزدیک صرف اپنی دنیا ہے۔ اگر انکی انفرادی زندگی کامیاب گزر گئی تو پھر انھیں کوئی غم نہیں۔ ان لوگوں کا پورا کردار اس مریضانہ ذہنیت میں رنگا ہوتا ہے۔ کاش وہ اپنے "خوبیٔ اصل" سے بلند ہو سکتے۔

آپ مشرق کی ابھرتی ہوئی قوموں میں سب سے زیادہ جاندار قوم کی ساری امیدوں کی آماجگاہ ہیں۔ اگر آپ میں ایسے سوچنے والے ہیں تو شرم کی بات ہے۔ اپنے سے بےنیاز ہو کر صرف دوسروں کیلئے سوچنا اور کچھ کر گزرنا۔ ۳۶ کروڑ انسان آپ سے اسکی امید کرتے ہیں۔ اگر آپنے پڑھ لکھکر ذمہ داری کی اس ہمہ وقت لگن کو اپنے اندر محسوس نہیں کیا تو اس یونیورسٹی کا مقصد فوت ہو گیا۔ اگر مرنے سے پہلے آپنے اپنے پیچھے ایک بہتر سماج چھوڑنے کیلئے جد و جہد نہ کی تو آپکی پوری زندگی اکارت ہو گئی۔ آج انسان کا سب سے بڑا گناہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی اپنے ساتھیوں کے مسائل سے چشم پوشی، اس دنیا کو ایک بہتر دنیا میں بدلنا، ننگے بھوکے اور جانوروں کی طرح بھٹکتے انسانوں کو سنوارنا، اور کسی حصے یا نسل سے بےپرواہ ہو کر ایک بہتر زندگی کی تخلیق کیلئے اپنی ساری ممکن کوششیں صرف کر دینا یہی آج کے انسان کی دنیا بھی ہے اور عاقبت بھی۔ دنیا کو سنوارنے کا کام زیادہ بہتر طریقے پر کس انداز سے ہو سکتا ہے یہ بعد کی بات ہے۔ اتنا کافی ہے کہ آپ میں یہ لگن ہو، یہ جذبہ ہو، اور یہ جذبہ ہمہ وقت آپ پر طاری رہے۔ آپ کسی بھی نازک سے نازک مرحلے پر صرف اپنے لئے کبھی بھی نہ سوچیں، کوئی کام صرف اپنے کو پیش نظر رکھکر نہ کریں۔ آپکا آرٹ، آپکی شاعری، آپکی تعلیم، آپکی گفتگو، آپکا میل جول ہو سکے تو آپکی پوری شخصیت ایک اجتماعی کردار میں ڈھل جائے۔ ہر جعلی چیز سے بےاطمینانی بلکہ بیزاری اور خوب سے خوب تر کی مسلسل جستجو آپکے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت بن جائے۔

بعض ذہن اس طرح سوچتے ہیں اور پھر ان کے لئے یہ خیال آتا ہے کہ اس دنیا کو جنت بنانے کے عزم میں کہیں انکی اپنی زندگی جہنم زار نہ بن جائے۔ دوسروں کیلئے پھولوں کی سیج تیار کرنے میں سارے کانٹے کہیں انھیں کی قسمت ہو کر نہ رہ جائیں اور ––– ایک بہتر سماج کی تخلیق میں کہیں انکی اور انکے ماں باپ کی زندگیاں تباہ ہو کر نہ رہ جائیں اور پھر انکی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں حوصلے شل پڑ جاتے ہیں ––– ایسا ہونا بالکل ممکن ہے اور کبھی کبھی ایسا ہوا بھی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو تو بھی آپ کامیاب ہیں، اور مبارک ہیں ایسے خوش قسمت جو دوسروں کیلئے اپنا سب کچھ تج دیں ––– لیکن بالعموم ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اسکا ڈر ضرور ہوتا ہے لیکن یہ ڈر اکثر حقیقت نہیں بن پاتا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب آپ دوسروں کے لئے وقف ہو جاتے ہیں تو دوسرے بھی اپنے کو آپکے لئے وقف کر دیتے ہیں اور آپ کا مستقبل اپنے دامن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ خدا کی دنیا بہت وسیع ہے اور کرنے کے کام بہت ہیں۔ لیکن آپ سب سے پہلے اپنے وطن کیلئے کچھ کیجئے۔ بھوک، بےروزگاری اور غربت کو مٹانے کیلئے اپنی حد تک کوشش کیجئے۔ گیتا اور قرآن کے نام پر لڑنے والوں کو انسانیت کے نام پر ملانے کی کوشش کیجئے۔ کچھ سوچئے اور ہو سکے تو کچھ کر دکھایئے۔ راستہ کٹھن ہے، راہی کم ہیں، اور رہنما مفقود۔ آپ میں سے ہر ایک کو رہنما بننا ہوگا ––– اور باوجود کوشش کے اگر آپ اپنی زندگی میں کچھ حاصل نہ کر پائے تو بھی یہ کم نہ ہوگا کہ اپنے بعد آنے والوں کیلئے آپنے راستے کے سارے پتھر ہٹا دئے ہونگے جن سے ٹھوکر کھا کر آپکی ہمتیں ٹوٹی تھیں۔

ہماری رائے میں:

بڑے لوگوں کی توجہ کے لئے

(مثلاً وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، رجسٹرار، پروفیسر، ریڈر وغیرہ وغیرہ)

کوئی تبدیلی یا انقلاب اک دم سے نہیں آجاتا۔ نہ ایک آدمی کے بل پر ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ جو قوم اصلاح اور بہتر انقلاب کی طلبگار ہوتی ہے اس کے ذہن اسی نقطہ کے گرد مرکوز ہو جاتے ہیں۔ "آرزوئے نایافت" انھیں ایک پل چین نہیں لینے دیتی۔ قوم کا ہر فرد ایک بہتر اور برتر سماج کی تخلیق کے لئے اپنے اندر وہی لگن پاتا ہے، جو اسکے رہنماؤں میں ملتی ہے اور پھر جب ذمہ داری کا یہ احساس ہر معمولی سے معمولی آدمی کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر کسی بڑے سے بڑے انقلاب کو دیر نہیں لگتی۔

ہم میں سے ہر فرد کو اپنے تمام قومی مسائل پر ذمہ دارانہ حیثیت سے غور کرنا ہے اور ان کا حل تلاش کرنا ہے۔ ہمارے مسائل مذہبی منافرت کے مسائل ہیں۔ ہندو فرقہ پرستی اور مسلم فرقہ پرستی کے مسائل ہیں، اور سب سے بڑھکر بھوک اور بیروزگاری ہے جسمیں بلا تفریق مذہب وملت ہم سب ایک دوسرے کے شریک ہیں، اجنبی تسلط اور غیر جمہوری نظام کا بھی تو ایک ورثہ ہے جسمیں ہندو اور مسلمان سب شریک ہیں، اور اس کا ایک ضمنی مسئلہ ہے ملک میں سب سے بڑے تنخواہ دار کی آمدنی میں بہت بڑا امتیاز۔ میں یہاں سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے تاجر یا سرمایہ دار کا مقابلہ نہیں کر رہا ہوں۔ میرے پیش نظر اس وقت صرف متوسط طبقہ ہے۔

اس متوسط طبقہ میں یہ بڑا فرق کیسے کم کیا جائے۔ یہ سرکاری قوانین کا کام نہیں، افراد کا اخلاقی فرض ہے اور وہ اس طرح کہ بڑے لوگ کچھ قربانی دیں۔ اس مبارک کام میں ہماری یونیورسٹی پہل کر سکتی ہے اور دوسرے لوگوں کے لئے نمونہ بن سکتی ہے۔ اس یونیورسٹی میں وہ لوگ بھی ہیں جنھیں ہزار ڈیڑھ ہزار اور دو ہزار روپے ماہانہ ملتے ہیں اور وہ بھی ہیں جنھیں مہینہ میں پندرہ دن دونوں وقت پیٹ بھرنے کو مل جائے تو بھی اپنے پیدا کرنے والے کو دعائیں دیتے ہیں۔ سارا مہینہ جان کی بازی لگا کر کام کرتے ہیں اور مہینہ کی پہلی کو ۳۰، ۴۰، ۵۰، ۶۰ روپے دیکھ کر انکے مدقوق چہرے تھوڑی دیر کے لئے کھل جاتے ہیں۔ لیکن آدھی درجن بچوں اور بیمار بیوی کے تصور سے انکے چہروں پر پھر سیاہی دوڑ جاتی ہے ـــــ کیا انکی ساری زندگی ایسے ہی بیت جائے گی؟

ہماری تجویز ہے کہ غیر سرکاری طریقہ پر شعبہ وار ایسا انتظام کیا جائے کہ ۹۹ روپے سے زیادہ کے تنخواہ دار ایک روپیہ ماہانہ دیں، ۲۰۰ سے اوپر پانے والے ۵ روپے، ۵۰۰ سے اوپر دس روپے اور ایک ہزار سے اوپر ۲۰ روپے۔ ہر شعبہ کا ایک غیر سرکاری فنڈ اس طرح منظم ہو جائے اور اسے ۹۹ سے کم کے تنخواہ داروں پر بانٹ دیا جائے۔ فنڈ کے ذریعہ تقسیم سے اس غریب کو بھیک، انعام، اور احسان، کے احساس سے نجات مل جائیگی اور ۱۵ دن کے بجائے ۲۵ دن پیٹ بھر سکے گا۔ یہ کام شعبہ وار بھی ہو سکتا ہے، یکجا بھی۔ کاش ہمیں کوئی پہل کرنیوالا مل جائے!!

یہ علی گڑھ ہے

ایک شہر میں ایک تاجر رہتا تھا۔ اسکی بیوی بہت بدصورت تھی۔ عام طور سے اسے اس وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنے سفر سے واپس آ رہا تھا راستہ میں اسے ایک نوجوان ملا۔ تاجر نے نوجوان کو اپنا سامان تجارت دکھایا۔ نوجوان نے سارے سامان کو چھوڑ کر تاجر کی بیوی کے حسن سحر انگیز کی دل کھول کر تعریف کی۔ بیوی پر تو اس کا جو اثر ہوا ہوا اسے چھوڑیئے لیکن تاجر اس سے بے انتہا خوش ہوا اور اپنا سارا ساز و سامان اس نوجوان کی نذر کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا وہ نوجوان علی گڑھ کا گریجویٹ تھا۔

علی گڑھ میں اس فن کو بٹرنگ کہتے ہیں۔ بٹرنگ انگریزی کا لفظ ہے۔ جسکے لغوی معنی ہیں مکھن لگانا۔ مجازی معنوں میں بیجا تعریف کرنا، مبالغہ آمیز تعریف کرنا، خوشامد کرنا بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن خوشامد کا لفظ اچھا نہیں، اس سے پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ بٹرنگ کیلئے کسی ہنر کی ضرورت نہیں یہ خود ایک ہنر ہے۔ آپ پڑھے لکھے ہوں، جاہل ہوں، تندرست ہوں، معذور ہوں، برسر روزگار ہوں یا بے روزگار، یہ نسخہ آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر معذور ہوں تو اور بھی اچھا ہے کہ ایسے لوگوں کیلئے اس سے بہتر پیشہ ممکن نہیں۔ آرام سے رہئے، نوکری کی فکر نہ کھاٹ کی۔ صبح دس بجے سو کر اٹھئے اور اپنے افسر پر دو چار ہاتھ پھیر آئیے بس کام تمام ہے۔ آپ کتنے ہی نامعقول ہوں لیکن اسکی نظروں میں آپ سے زیادہ اہل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

علی گڑھ میں کسی منچلے نے ایک ڈیری فارم کھول دیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں کی آب و ہوا مکھن بنانے کیلئے سازگار تھی۔ فارم کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسکے استعمال کیلئے بھی اس سے بہتر آب و ہوا ممکن نہیں۔ یہاں اسکی ضرورت اتنی بڑھی کہ لوگ مکھن گھر گھر بنانے لگے۔ اور اب فارم کی قید سے بھی آزاد ہو گئے ہیں۔

علی گڑھ میں بٹرنگ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور اسکا سکہ ہر جگہ چلتا ہے کالج میں، مدرسہ میں، ہوسٹل میں، مطبخ میں، دفتر میں، کوٹھی پر، ریل میں، کھیل میں، سفر میں، حضر میں۔ حاکم احمق ہے، بیوی بدمزاج ہے، افسر چڑچڑا، اپنے عشق میں کامیابی مشکل ہے، امتحان میں فیل ہونے کا خطرہ ہے۔ اس نسخہ کو استعمال کر کے دیکھئے سارے مسائل آن کی آن میں حل ہو جائینگے اور وہ بھی ایسے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ آپ جب بٹرنگ کا ہاتھ پھیرتے ہیں خود اسے بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر فدوی کے افسر نہایت احمق ہیں اور جس میدان کے مرد ہیں اس کے علاوہ ہر فن میں طاق ہیں۔ لیکن میں ہمہ وقت ان کے گن گاتا ہوں نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو اس میدان کا سب سے بڑا ادبی سمجھتے ہی ہیں۔ میری ذہانت کے بھی بے انتہا قائل ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے خود وہ بھی قائل نہ تھے۔ بات کرتے وقت کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ہوسٹل میں آئے تو وارڈن صاحب پر نظر پڑی۔ دیکھکر ٹھٹھک گئے۔ رات کو ایک پرانے ساتھی سے معلوم ہوا کہ وارڈن صاحب مکھن پسند ہیں۔ دوسرے دن حاضر ہو



علی گڑھ میں محمود صاحب کو لوگ قاری محمود کے نام سے جانتے ہیں۔ انگریزی بولتے وقت ان کا لب و لہجہ، آواز کی کڑک اور گرج انھیں یقیناً انگریزی زبان کا قاری سمجھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ کڑک اور گرج ان کے ہر ہر فعل میں نمایاں ہے۔ ڈھیلا ڈھالا پن انھیں پسند نہیں، وہ خود چاق چوبند رہتے ہیں اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے اسکی توقع رکھتے ہیں۔ محمود صاحب کو کبھی کسی نے مضمحل اور مرجھایا ہوا نہیں دیکھا۔ محمود صاحب بڑے دبلے پتلے اور اکہرے بدن کے آدمی ہیں۔ گرمیوں میں عام طور سے صرف پینٹ شرٹ پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں جب اس سے کام نہیں چلتا تو سوٹ پہننے لگتے ہیں۔ دور سے دیکھئے تو ان کی کوئی بات اثر نہیں چھوڑتی لیکن انکی رفتار و گفتار اور خط و خال سے جو وقار ٹپکتا ہے وہ بڑے بڑے بارعب لوگوں میں نہیں نظر آتا۔ ان کے مزاج کی سادگی ہی ان کے وقار کی ضامن ہے۔ انکی نشیلی مخمور آنکھیں جو عام طور سے چڑھی رہتی ہیں اکثر لوگوں کو دھوکہ میں ڈال دیتی ہیں اور وہ انکی کڑک اور ترشی دیکھ کر شبہ میں پڑ جاتے ہیں، لیکن در اصل ان بھاری چڑھے ہوئے پپوٹوں کے پیچھے انسانی ہمدردی اور دلنوازی کے وہ چراغ جل رہے ہیں جو شب زندہ دار زاہدوں کو بھی نصیب نہیں۔ محمود صاحب طلبا کی پریشانیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی کوئی شکایت، کوئی مسئلہ اور کوئی تکلیف ایسی نہیں جسکے ساتھ محمود صاحب کا دل نہ دھڑکتا ہو۔

محمود صاحب یونیورسٹی میں رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہیں۔ اس سے پہلے شعبۂ انگریزی کے صدر تھے۔ جب انگریزی پڑھاتے تھے تو طرز بیان اور پڑھانے کے اعتبار سے لوگوں کے بہترین استاد تھے۔ اب رجسٹرار ہیں تو اس خوبی سے کام کیا ہے کہ مثال قائم کر دی ہے۔ انگریزی ادب پر محمود صاحب کی سی نظر ان لوگوں کو بھی نصیب نہیں جو برسوں انگلستان کے بہترین اساتذہ اور کتب خانوں سے اکتساب فیض حاصل کر کے لوٹے ہیں۔ خصوصاً ڈراما پر محمود صاحب جیسا عبور رسالہا سال کے ریاض کے بعد بھی ممکن نہیں۔ شیکسپیر تو وہ ایسے پڑھاتے تھے کہ خود شیکسپیر اگر دیکھ لے تو طبیعت خوش ہو جائے۔

محمود صاحب مارکسی فلسفۂ حیات سے بہت متاثر ہیں۔ اس فلسفہ کو انھوں نے اپنے ذہن کے کسی دریچہ کی زینت نہیں بنایا ہے۔ بلکہ وہ اسے عملی زندگی میں برتتے ہیں۔ عام انسانی ہمدردی اور طلبا کے معاملات میں دلچسپی کا جو اظہار محمود صاحب کرتے ہیں وہ بڑے اچھے اچھے اساتذہ میں موجود نہیں۔

محمود صاحب کی شخصیت بڑی جاذب نظر ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں دوسروں کو اپنی طرف بڑی جلد کھینچ لیتے ہیں۔ علی گڑھ میں ان کے درجنوں دوست ہیں اور ہر ایک انکی خاطر سب کچھ تج دینے کو تیار۔ خوبیاں بہت سے لوگوں میں ہوتی ہیں لیکن جو اپنے برابر والوں سے بھی لوہا منوالیں ایسی مثالیں مشکل ہی سے ملتی ہیں۔

محمود صاحب جب کام کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو پھر کسی رکاوٹ کو نظر میں نہیں لاتے۔ ان کے تمام کام ان کے عزم کی اسی پختگی کے مظہر ہیں۔ وہ جس کام کو کرتے ہیں حق ادا کر دیتے ہیں۔ معمولی معمولی پروگراموں کو بے حد دلچسپ بنا دینا ان کے لئے معمولی بات ہے۔ یونیورسٹی کے پچھلے چند سالوں کے مختلف پروگرام ان کے حسن انتظام اور خوش سلیقگی کی غمازی کرتے ہیں۔ محمود صاحب اصولوں کے سلسلہ میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ اور کام کو قاعدہ کے خلاف کرنا انھیں بہت ناگوار گزرتا ہے۔ اگر انھیں کسی بات میں ذرا بھی جھول جھال نظر آ جائے تو فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ پھر ان سے کام لینا آسان نہیں۔ لیکن اگر انھیں اسکا یقین ہو جائے کہ بات سچی ہے تو پھر اسمیں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اور اسمیں کسی اصول کی پرواہ نہیں کرتے۔ سچائی کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ طلبا میں محمود صاحب بہت مقبول ہیں۔ کوئی مشکل ہو محمود صاحب سے رجوع کیا جاتا ہے اور وہ منٹوں میں اسے حل کر دیتے ہیں۔ وہ طلبا کے مفاد کی خاطر مختلف جگہ دل کھول کر لڑتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے جو عزت و احترام عام طلبا میں ہے گنتی کے چند اساتذہ ہی کو نصیب ہوا ہوگا۔ لیکن یونیورسٹی کی رجسٹراری قبول کر کے محمود صاحب نے علم و ادب، یونیورسٹی اور خود اپنے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا ہے۔ انگریزی ادبیات کے ایک ایسے شستہ مذاق استاد کو کھو کر شعبۂ انگریزی کو جو ٹھیس پہنچی ہے۔ شاید اسکی تلافی نہ ہو سکے۔ یونیورسٹی نے انھیں معاف کر دیا ہے، لیکن ادب انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

یہ پندرہ دن ——

یونیورسٹی لائبریری کیلئے طلباء کی مشاورتی کمیٹی بہت جلد عمل میں آنیوالی ہے

بشیر صاحب کا جمہوری اقدام

۲۷ نومبر کو یونین ہال میں بشیر صاحب (لائبریرین) کی دعوت پر بلائی گئی ایک میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ کا مقصد لائبریری کے نظم و نسق میں طلباء کی ایک مستقل مشاورتی کمیٹی کو شریک کرنا ہے۔ بشیر صاحب کے اس اقدام پر طلباء میں مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ لائبریری مشاورتی کمیٹی جلد ہی عمل میں آجائے گی۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم بشیر صاحب کے اس رویہ کی تعریف کریں جو ہمارے پچھلے نوٹ کے سلسلہ میں انھوں نے اختیار کیا۔ انھوں نے بہت سی دقتوں اور دشواریوں کے ذکر کے بعد ان ترقیوں کی طرف توجہ دلائی جو روز بروز لائبریری کے انتظام کے سلسلہ میں عمل میں آرہی ہیں۔ بزرگانہ شفقت سے کام لے کر انھوں نے پائنیر کے نمائندہ کو باوجود ایک غلط بیانی کے معاف کر دیا ہے۔ امید ہے وہ (نمائندہ پائنیر) بھی اپنی غلطی کی تصحیح کرنے میں دیر نہ لگائیں گے اور آئندہ اس کا لحاظ رکھیں گے کہ ان کی رپورٹنگ مصدقہ معلومات پر مبنی ہو۔

"بین الاقوامی مسائل" پر ڈاکٹر نورالحسن کا لیکچر

یونیورسٹی میں غیر ملکی طلباء کی سرگرمیاں

• ۲۰ نومبر کو فارن اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے یونین ہال میں ڈاکٹر نورالحسن کا ایک لیکچر ہوا۔ لیکچر کا موضوع تھا "بین الاقوامی مسائل"۔ ڈاکٹر نورالحسن نے اپنے پر مغز لیکچر میں سارے مسائل کی تحلیل کی اور مختلف واقعات کی پشت پر جو سامراجی اور عوامی طاقتوں کی کشمکش کام کر رہی ہے اسے واضح کیا۔ جلسہ باوجود غیر مناسب وقت کے (بیڈ منٹن ٹورنامنٹ کے سبب) خاصا کامیاب رہا۔

• پہلی دسمبر کو میرس ہال میں غیر ملکی طلباء کی انجمن کی طرف سے 'کلچرل شام' منائی گئی۔ بیرونی طلباء کی ان تہذیبی اور علمی سرگرمیوں میں ہم سب کو زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا چاہئے تاکہ ہم ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں۔

ہندوستان کا تعلیمی نظام ہماری قومی زندگی کے لئے نقصان دہ ہے

یونین میں انعامی اردو ڈیبیٹ

۲۹ نومبر کو یونین لیکچر روم میں اردو کی انعامی ڈیبیٹ منعقد ہوئی جس میں بہت سے مقرروں نے شرکت کی۔ مباحثہ کا موضوع تھا "ہندوستان کا تعلیمی نظام ہماری قومی زندگی کے لئے نقصان دہ ہے"۔ مسٹر قاسم، مسٹر انعام الحق اور مسٹر سلطان علی رشید کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام ملا۔

• ۳۰ نومبر کو یونین ہال میں انگریزی کی انعامی ڈیبیٹ ہوئی جس میں ۲۱ مقررین نے حصہ لیا۔ این۔ اے کریم، بھنڈاری اور سلطان علی رشید کو پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام ملے۔ مباحثہ کا موضوع مندرجہ ذیل تھا۔

"بیسویں صدی میں ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی نے تیسری جنگ کے خطرہ کو ختم کر دیا ہے۔"

ایرانی وفد علی گڑھ میں

یکم دسمبر کو ایرانی وفد جو یونسکو کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ہندوستان آیا ہوا تھا علی گڑھ پہنچا۔ شام کو ۵ بجے یونین ہال میں ایرانی وفد کو اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا۔ ڈاکٹر ہادی حسن نے فارسی زبان میں ایرانی وفد کا استقبال کیا جسکے جواب میں وفد کے لیڈر اور ایک رکن نے بھی تقریریں کیں۔

این۔ آر۔ سی کلب اے میں یوم مجاز

۷ دسمبر کی شام کو این۔ آر۔ ایس۔ سی کلب میں سرور صاحب کی صدارت میں یوم مجاز منایا گیا۔ مجاز کی مختلف غزلوں کو اشتیاق خاں، مشیر حسین زیدی اور سمیع اللہ وغیرہ نے ترنم سے پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے زیر صدارت ایک بزم مشاعرہ بھی منعقد ہوئی۔ جس میں شرکت کرنے والوں میں وامق جونپوری، قمر رئیس اور شہاب جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسکے بعد جاوید اختر (مجاز کا بھانجہ) نے مجاز کی طرز میں مجاز کا کچھ کلام پیش کیا۔

تقریر اور تحریر یونین کی بنیادی سرگرمیاں ہونی چاہئیں

یونین کی اسپیکرس اور رائٹرس کلب میں سرور صاحب کی افتتاحی تقریر

۷ دسمبر کو ۵ بجے شام یونین کی اسپیکرس اور رائٹرس کلب کا افتتاح ہوا۔ جس میں چند اساتذہ اور ۵۰ ممبروں کی چائے سے تواضع کی گئی۔ سرور صاحب نے کلب کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا "تقریر میں شخصیت کا بھی اثر ہونا چاہیے۔ شخصیت آتی ہے مغز سے۔ مغز آتا ہے مطالعہ سے اور مطالعہ کے لئے خون جگر کی ضرورت پڑتی ہے۔"

یونین کا پہلا ششماہی بجٹ جنرل باڈی نے منظور کر دیا

۸ دسمبر کو یونین کا پہلا ششماہی بجٹ (یکم اکتوبر سے ۳۱ مارچ تک) جنرل باڈی نے متفقہ طور پر پاس کر دیا۔ یونین کی آمدنی کا تخمینہ ۵۰۰۰ روپیہ لگایا گیا ہے اور اخراجات کے مختلف مدیں ہیں:-

سیکشن ۱۔ یونین کا نظم و نسق Establishment ۳۲۹۵ روپیہ، باغات اور پانی ۱۵۰ روپیہ، بجلی ۴۵۰ روپیہ، دفتری اخراجات ۳۰۰ روپیہ، مرمت سائیکل ۲۰ روپیہ، الیکشن انسٹالیشن ۹۰ روپیہ۔ میزان ۴۲۰۵ روپیہ۔

سیکشن ۲۔ یونین کے محکمے:- لائبریری ۲۰۰ روپیہ، گیمس اور کامن روم ۳۰۰ روپیہ، اسپیکرس اور رائٹرس کلب ۱۰۰ روپیہ، انٹرمیڈیٹ اسٹوڈنٹس سوسائٹی ۳۰۰ روپیہ، اور یونین اسکول ۲۵ روپیہ، میزان ۹۲۵ روپیہ۔

سیکشن ۳ یونین کی سرگرمیاں:- یونین بلیٹن ۲۰۰ روپیہ، استقبال ۲۵۰ روپیہ، سفر خرچ ۱۵۰ روپیہ، یوم النبی ۵۰ روپیہ، یوم گرو نانک ۵۰ روپیہ، اسلام پر تقاریر کا سلسلہ ۲۵ روپیہ، کل ہند انگریزی اور اردو ڈیبیٹ ۱۵۰ روپیہ، کل ہند مشاعرہ ۶۰۰ روپیہ، کل ہند کوی سمیلن ۲۵۰ روپیہ۔ میزان ۱۷۱۵ روپیہ۔

سیکشن ۴۔ دستوری مدیں:- صدر کا Contingency فنڈ ۱۳۰ روپیہ، یونین ریزرو فنڈ ۷۵ روپیہ۔ میزان ۲۰۵ روپیہ۔

کل میزان ۵۰۰۰ روپیہ

تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ

(از پروفیسر یاسین)

(۴)

مسٹر بیک نے اس سال کی ترقی کو اجمالاً یوں بیان کیا ہے:

"پچھلے سال کالج نے جو ترقی کی وہ کسی بھی گزشتہ سال کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ طلبا کی تعداد میں افزونی، امتحانات میں بہتر نتائج، کھانے کے انتظام میں اصلاح، نماز میں طلبا کی طرف سے نسبتاً زیادہ پابندی، مدرسہ شہسواری کا وجود میں آنا، باقاعدہ ڈرل کا عمل میں آنا، اور کالج میگزین کا مستحکم بنیادوں پر اجراء، یہ سب اس کے شواہد ہیں۔ اور طلبا میں انتظامی صلاحیت اور حب الوطنی کے جذبات پہلے سے زیادہ ہیں۔ لیکن دوسری طرف درس قرآن میں پہلی سی پابندی نظر نہیں آتی۔ یونین اور اخوان الصفا بھی بے عمل سی ہو گئی ہیں۔ مگر ڈیوٹی سوسائٹی نے اپنی پچھلی کوششوں پر اضافہ کیا ہے، کرکٹ کلب نے پچھلے معیار کو برقرار رکھا ہے، اور فٹ بال کلب نے اپنا معیار اونچا کیا ہے، اور اگرچہ کالج نے ابھی تک صحیح معنی میں کوئی اسکالر پیدا نہیں کیا۔ تاہم میری رائے میں وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے بعض نہایت اعلیٰ درجے کے باہمت، وفادار نوجوان پیدا کیے ہیں۔ جو حکومت اور خود مسلمانوں کے لیے قابل قدر خدمت انجام دے سکیں گے۔"

لیکن کالج کی ترقی کے بارے میں یہ سب دل خوش کن نظریے اگلے ہی سال بری طرح ملیامیٹ ہو گئے۔ بیس برس تک سرسید نے کالج کی تخلیق کے لیے جد و جہد کی تھی اور سارا مالی انتظام اپنے ہی ہاتھوں میں رکھا تھا، خود ہی تعمیر کے کام کی نگرانی کرتے، خود بجٹ بناتے اور تمام آمد و خرچ کی نگرانی کرتے۔ کالج کی ترقی اور اس کے کام کے پھیلاؤ، اور خود اپنی روز افزوں کمزوری کے سبب، کام کا ایک بڑا حصہ دوسروں کے سپرد کر دیا تھا اور آخری برسوں میں انگریزی نہ جاننے کے باعث بنک کے حسابات بالکل اپنے معتبر ہیڈ کلرک کے اوپر چھوڑ رکھے تھے۔ یہ شخص بہت بڑا دھوکے باز تھا اور کئی برس سے کالج کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہا تھا۔ اتفاقاً ۱۸۹۵ء میں اپنی بیماری کے سبب وہ پکڑا گیا۔ اور اُس وقت معلوم ہوا کہ اس نے سرسید اور بڑے بڑے ٹرسٹیوں کے دستخط بنائے تھے اور کالج کے سرمایہ اصلی کی ضمانت پر بنک سے روپیہ حاصل کرتا رہا تھا۔ اس کی دھوکے بازیوں کی تفصیل مکمل طور پر تو کبھی بھی نہ معلوم ہو سکے گی، اس نے کتنے ہی منی آرڈر اور رجسٹرڈ خطوط اُڑا لیے، جو کالج کے خزانے میں جانے چاہیے تھے۔ جب اسے جیل میں بند کر دیا گیا اور پوری تفتیش کی گئی تو غبن کا اندازہ ۱۱۵۳۲۱ روپے تھا۔ بوڑھے سرسید کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کی قوم نے اس کی عظیم خدمات کے پیش نظر اسے معاف کر دیا لیکن مجھے شبہ ہے کہ اتنے بڑے قومی سرمایہ کے نقصان پر اس نے خود اپنے آپ کو معاف کیا یا نہیں اور گھنٹوں سر جھکائے اس آفت کے بارے میں سوچتے رہتے۔ سرسید نے اور ان کی طرف سے دوسروں نے ایک اپیل شائع کی تاکہ غبن شدہ روپیہ پورا ہو جائے لیکن خود سرسید اتنے دل شکستہ تھے کہ بڑے پیمانے پر اب کوئی تحریک نہیں چلا سکتے تھے۔

قدرتی طور سے اس انکشاف نے کالج پر لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیا اور طلبا کی تعداد گھٹ گئی اور مزید کمی مقامی حکومت کی اس کارروائی سے ہونے لگی کہ سرکاری اور امدادی کالجوں کی فیس سو فیصدی بڑھا دی گئی۔ پرنسپل کی درخواست پر اس نے اس امر کی اجازت دے دی کہ یہ اضافہ تین برسوں میں بانٹ دیا جائے۔ اس کے بعد جا کر بڑھی ہوئی فیس لی جائے اور کالج کو اجازت دی گئی کہ بورڈنگ ہاؤس کی فیس کم کر کے غریب طلبا کے بوجھ میں کمی کی جائے۔ فیس بڑھا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر اعلیٰ تعلیم کی ترقی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا، اور پھر اگر ہم لوگوں کی آمدنی پر ۱۸۹۶-۹۷ کے قحط کا اثر بھی اس میں شامل کر لیں تو ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیان طلبا کی تعداد میں کمی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کالج اور اسکول میں طلبا کی کل تعداد جو ۱۸۹۵ء میں ۵۶۵ تھی ۱۸۹۹ء میں ۳۴۳ رہ گئی اور بورڈر ۳۲۹ سے گھٹ کر ۲۳۲ رہ گئے۔

کالج فنڈ میں غبن کے انکشاف سے بہت پہلے بیک نے بورڈنگ ہاؤس کا حساب ٹھیک ٹھاک کرنا شروع کر دیا تھا ...... انھوں نے بڑی بے ترتیبی دیکھی اور تین برس میں ایک ایسا سائنٹفک طریقہ بنا دیا جس پر معمولی سی تبدیلی کے بعد ہم آج کاربند ہیں۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں مسٹر ایل فیننگ کالج اسٹاف میں شریک ہوئے ...... ۱۸۹۶-۹۷ء کی امتیازی خصوصیت اسکول کی از سر نو تنظیم تھی ......

مسٹر ولیم جورسٹ ۱۸۹۶ء کے شروع میں ایک طویل عرصے کی ہیڈ ماسٹری کے بعد اسکول چھوڑ چکے تھے اور کم تنخواہ اور ماسٹروں کی غیر مستقل تقرری کے سبب اسکول میں تربیت یافتہ اور منظم اسٹاف نہ ہو سکا ...... بیک ڈگری یافتہ کو عارضی طور سے اس میں لگا لیتے تھے، جو بہت غیر مستقل ٹھہرے، اس لیے تجربہ کا سوال ...... اسکول میں مسٹر جے۔ آر۔ گورنا کے ۱۹۰۰ میں ہیڈ ماسٹر ہونے تک کوئی خاص اصلاح نہ ہو سکی۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا ...... سرسید کالج۔

انی ہی نہ تھے، اس کی بقا اور ترقی کے لیے روح رواں تھے۔ یہ ساری جگہ ان کی شخصیت سے ایسی متاثر تھی، ان کے اس قدر زیر اثر تھی کہ ہم ان دنوں میں یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ سرسید کی تخلیق کا کوئی حصہ ان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ کالج کے اتنے بڑے انتظام کے علاوہ ...... ان کی موجودگی ایک اخلاقی قوت بھی تھی اور کالج کی زندگی کیلئے سب کچھ۔ چھوٹے طلبا اور وہ جنھیں ان سے قریبی تعلق کا موقعہ نہ ملتا، ان کے اعلیٰ اخلاق اور عظیم شان سے متاثر ہوتے۔ اور ہم میں سے وہ جو ان کے قریب تھے اپنا سارا سرمایہ ان کی اس عزت کو سمجھتے تھے جو ہمارے دلوں میں تھی۔ ہمارا کام ان کے بعد بھی چل رہا ہے، مگر ہم اپنی خدمت کے سب سے بڑے انعام ان کی رضا جوئی سے حاصل ہونے والی تسکین کو کھو چکے ہیں۔

کالج کے انتظام کے سلسلے میں سرسید کے زیر اہتمام یہ کچھ تھا:۔
(۱) کالج کی عام پالیسی کی نگرانی (۲) کالج کی توسیع کے لیے چندے کی فراہمی (۳) حسابات اور مالیات (۴) تعمیرات (۵) کالج کی جائداد (۶) انسٹیٹیوٹ پریس (۷) کتابوں کی فروخت (۸) ایجوکیشنل کانفرنس کی تنظیم۔ سید محمود مرحوم جو والد کی زندگی میں جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کر چکے تھے، سکریٹری ہو گئے اور کالج کی عام پالیسی کی نگرانی بھی نام کے طور پر اپنے ہی ہاتھ میں رکھی۔
لیکن سید محمود اب اپنی پچھلی شخصیت کا محض سایہ رہ گئے تھے اور بہت جلد یہ اندازہ ہو گیا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص آنا چاہیے۔ کالج کے حسابات اور مالیات بیک کے سپرد کیے گئے جو جوائنٹ سکریٹری اور پرنسپل تھے ...... نواب محسن الملک نے جو عرصہ دراز سے سرسید کے ساتھ کام کرنے اور کالج کے لیے عظیم خدمات انجام دینے کے سبب سرسید کے قدرتی جانشین تھے، ایجوکیشنل کانفرنس کی تنظیم اور چندے کی فراہمی کا اہم کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور یہ صرف محسن الملک اور بیک کی متحدہ جدوجہد کا ثمرہ تھا کہ کالج کا شیرازہ ۱۸۹۸ء میں بکھر جانے سے بچ گیا ...... سرسید کی وفات کے ایک سال بعد (کالج پر قرضے کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے) سرسید میموریل فنڈ کی تحریک اٹھائی گئی۔ تجویز یہ تھی کہ موجودہ قرضے چکائے جائیں، تخمینہ شدہ روپیہ جمع کیا جائے اور علی گڑھ کالج کی فائدہ مندی کو سارے اطراف میں پھیلایا جائے تاکہ یہ ایک مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر جائے ...... حکومت نے کالج کے ساتھ عملی ہمدردی اور دلچسپی دکھائی۔ مسٹر جے ڈی لاٹوش قائم مقام لفٹننٹ گورنر جولائی میں کالج میں آئے اور نہ صرف اپنی جیب سے اس کی مدد کی، بلکہ اس کی مشکلات میں مدد دینے میں ہر ممکن کوشش کی۔ وہ وائسرائے لارڈ الجن کا ایک ہمدردانہ خط بھی لائے جنھوں نے سرسید فنڈ میں ...... روپیہ دیے۔ سر انٹھونی میگڈانل نے انگلستان سے واپسی پر کالج کی سرکاری امداد میں ۲۰۰ روپیہ ماہانہ کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح سرکاری امداد ۱۵۰۰ روپیہ ہو گئی ...... نواب رام پور نے ...... روپیہ دیے۔ ان کوششوں سے کالج نے اپنی فوری مشکلات پر قابو پا لیا ......

۱۸۹۸ء کے آخر میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا ...... اس کانفرنس میں محمڈن یونیورسٹی کی اسکیم عوام کے سامنے پیش کی گئی۔ اور وفادار پنجاب نے، جسے سرسید نے مسلمانان ہند کا "دل زندہ" کہا تھا، اس کی جوش و خروش سے تائید کی ...... ستمبر ۱۸۹۹ء میں تھیوڈور بیک کا (کالج کے لیے بے انتہا دوڑ دھوپ اور شدید ذہنی اور جسمانی بوجھ کے عالم میں) انتقال ہو گیا۔ سرسید کے بعد کالج پر سب سے بڑا احسان بیک کا ہے، اور ان کی موت پر کالج کی زندگی کا پہلا باب ختم سمجھنا چاہیے ......
اکتوبر ۱۸۹۹ء میں انگلینڈ سے واپسی پر مجھے بیک کا جانشین مقرر کیا گیا اور اسٹاف کی قوت میں کورنا اور جی گارڈنر براؤن کی تقرری سے مزید اضافہ ہوا۔ طلباء کی تعداد بھی بڑھی۔ اور ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء میں ۳۵۰ بورڈر ہو گئے جبکہ ۱۸۹۸ء میں صرف ۳۲۹ تھے۔ اب اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس قدر لڑکوں کی نگرانی صرف کسی ایک پروفیسر کی ذاتی ملاقات اور میل ملاپ پر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ اس لیے ہم نے سب پراکٹری کا طریقہ جاری کیا ......
۱۹۰۱-۱۹۰۰ء میں طلباء کی تعداد میں اور اضافہ ہوا، کالج اور اسکول میں ۵۰۰ طلباء تھے جن میں ۴۱۵ بورڈر تھے۔ اس سال نئی اقامت گاہ کی کمی کا بری طرح احساس ہوا ...... سر انٹھونی میگڈانل نے صوبائی بجٹ سے ...... ۲۰،۰۰۰ روپے دلا کر ایک نئی عمارت کا انتظام کر دیا ...... عمارت بننا شروع ہو گئی، پہلے اور اس مرتبہ کالج کھلنے پر میگڈانل بورڈنگ ہاؤس طلباء کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہوگا (جس میں طلبہ حسین وارڈ کی طرح اسکول کے بجے ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں رکھے جائیں گے)
اس سال ...... مسٹر براؤن کی کوششوں کی بدولت نیا اقامتی سسٹم شروع ہوا ...... اسکول کے سامنے ایک بنگلہ کرائے پر لیا گیا اور ہیڈ ماسٹر براؤن کچھ طلباء کے ساتھ اس میں پہنچ گئے ...... یہ انگلش ہاؤس مالی اور انتظامی دونوں لحاظ سے ایک کامیاب تجربہ ہے، جس کا سہرا براؤن کے سر ہے، جو بغیر کسی صلے کے اپنا کام کر رہے ہیں ......
اپریل ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن نے کالج کا ملاحظہ کیا، اور (میری تجویز پر) ہسپتال کے کھولے جانے کے لیے ...... روپے کے عطیے کا وعدہ کیا اس شرط پر کہ ۱۲ دوسرے اشخاص ...... فی شخص دے کر ہسپتال کی مجوزہ رقم ...... ۱۵ پوری کریں۔ مجھے خوشی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ...... ۱۰ روپے جمع ہو گئے، نواب بھاولپور کا عطیہ ...... ۱۰ اس کے علاوہ ہے ...... اب پلان تیار ہے اور عمارت بن رہی ہے (باقی)

علی گڑھ کا قاعدہ

الف ۔ الف سے آل احمد سرور: اردو کے سب سے زیادہ مشہور نقاد۔ شفیق استاد اور بہت اچھے انسان۔ ہنس مکھ چہرہ پر مفکرانہ نقوش، حسین گفتار اور حسین اخلاق کا نمونہ۔ تحریر و تقریر میں اردو شاعری سے متاثر ہیں۔ خاصکر اقبال کے "خون جگر" اور "لالہ و گل کی نمود" وغیرہ سے، اور خود اپنی شاعری سے دوسروں کو متاثر کر رہے ہیں۔ اقبال کے بعد رشید صاحب اور ذاکر صاحب کے قائل ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی ہیں۔ حکومت ہند کی طرف سے اردو کے کنوینر ہیں۔ ایس ایس بال کے پروردہ ہیں، عطاء اللہ خاں، مرزا انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر، ہیچمنٹ آف انڈیا

ایڈیٹر کی ڈاک

مسلمان ہندوستان میں

—— ۲۵ نومبر کے علیگ میں "علیگ کے لئے لکھئے" کے تحت آپ نے جو موضوع رکھا ہے وہ بیحد اہم ہے۔ میرا خیال ہے کہ ——

جو شخص بھی ہماری اس سرزمین ہند پر پیدا ہوا ہے وہ اس ملک کا ہر طرح پورا پورا حقدار ہے۔ خیالات کی تبدیلی سے وطنی دوستی میں کوئی رکاوٹ ہرگز نہیں پڑتی۔ تم ہندو ہو ہوا کرو۔ میں مسلمان ہوں ہوا کروں۔ ایک شخص کمیونسٹ ہے ہوا کرے کیا ہوا اگرچہ ہم سب کے نظریات اور خیالات ہم تینوں سے علیحدہ ہیں ہم سب ایک ملک کے باشندے اور انسان ہیں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔

بزم علیگ کی طرف سے ۱۶ دسمبر بروز اتوار ۸ بجے شب نشیمن آفتاب میں ڈاکٹر حسام کی صدارت میں ایک بزم مشاعرہ منعقد ہو رہی ہے مشاعرے میں پڑھنے اور سننے کے لئے تمام طلباء کو دعوت عام دی جاتی ہے۔

سے بیلیو گرافی کے اردو سیکشن کے انچارج ہیں اور شعبہ اردو میں پوسٹ گریجویٹ کلاس بھی لے لیتے ہیں۔ علی گڑھ کی معروف ترین ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ اسکے باوجود اس دیار میں جہاں بہت سے لوگ باوجود معروف نہ ہونے کے اپنے کو بہت زیادہ معروف دکھلانے

ملک میں ایسے لوگ کافی پیدا ہو چکے ہیں جو مسلمانوں کو ملک کا غدار اور دشمن سمجھتے ہیں۔ پاکستان بنانے کے جرم میں وہ باقی ماندہ مسلمانوں سے ہر وقت چوکتے رہتے ہیں کہ کہیں اندر ہی اندر پھر کسی دوسرے پاکستان بنانے یا اپنے نئے پاکستان کی جاسوسی کا جال

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے، یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ نے ۱۰ / ۱۱ دسمبر کو تمام خارج شدہ طلباء کو واپس بلا لینے کا مبارک فیصلہ کیا ہے یونیورسٹی کے تمام حلقوں میں اس خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

کی کوشش کرتے ہیں، سرور صاحب اپنی معروفیات کو چھپاتے ہیں اور دوسروں پر احسان نہیں کرتے۔

ب ۔ ب سے **بشیر صاحب** علی گڑھ کے قدیمی "گھنگھاروں" میں ہیں۔ اور لٹن لائبریری کے (جسکا نام اب یونیورسٹی لائبریری ہو گیا ہے، پتہ نہیں کیوں۔ شاید دوسری جگہ نام بدلنے کی وبا نے یہاں بھی اثر ڈالا) لائبریرین ہیں۔ کئی ایشیائی اور یوروپی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اور اتنی بڑی لائبریری کے سارے کام کی نگرانی کے باوجود اسسٹنٹ لائبریرین صاحبان کی طرح بوکھلائے ہوئے نہیں رہتے۔ بڑے سلیقہ اور ٹھنڈے دل سے بات کرتے اور سنتے ہیں۔ ہر شکایت کو سنکر اسے رفع کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ لائبریری میں ۸، ۹ گھنٹے سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ اسکے باوجود پتہ نہیں کیوں اس سکون، آسانی اور کتابوں تک پہنچ کا جسکی ایک لائبریری میں توقع کی جاتی ہے فقدان ہے ہر شخص گھبرایا ہوا سا رہتا ہے۔ (مسلسل)

وتنیں پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان بھی میرے خیال میں ۶۰ برس کی کانگریس پارٹی کمان اپنے اصولوں کو توڑ دینے اور آزادی حاصل کرنے کی نیت سے ملک کے بٹوارے کو قبول کر لینے میں مسلم لیگ کی نفرت انگیز اور حماقت آمیز سیاست کی وجہ سے عالم وجود میں آیا۔ اگر ہندو قوم پہلے سے ذات پات چھوت چھات چھوڑ چکی ہوتی اور جیسی تدبیر اور عقلمندی کا ثبوت اسوقت دیا جا رہا ہے، وہ ہے دس سال قبل پہلے سے دینے کی جد و جہد جاری کی ہوتی تو ایک جناح نہیں دس نہیں پچاس جناح بھی اگر مسلمانوں کو ورغلانا اور بیوقوف بنانا چاہتے تو ان کو کوئی زمین پر ٹکانے کو نہیں ملتی اور وہ خود بیوقوف ہو کر بیٹھ جاتے۔ آج اس بات کو کوئی نہیں کہتا کہ ہمیں بٹوارے اور تقسیم قبول کئے جانے والی کمیٹی میں ایک مسلمان مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے بر سر عام اس بات کو چیخ چیخ کر کہا کہ ہرگز نہیں ہم کسی قیمت پر ملک کے ٹکڑے کرنا پسند نہیں کرتے جیسی مذہبی تقسیم کو ہم۔ ۶۰ برس کی کانگریس کی تاریخ میں غلط کہتے آرہے ہیں کیا آج ہم اس سے منہ موڑ لیں گے۔ اور پھر کوئی ہمت اور جرات نہیں کرتا یہ کہنے کی کہ یہی کانگریس ہائی کمان کے مہان نیتا تھے جنھوں نے اپنے کیرکٹر کی کمزوری سے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اس کاغذ کے ٹکڑے پر اپنی انگلیوں سے قلموں سے دستخط کر دئے۔ جس نے لاکھوں دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جو اب آئندہ کیلئے کچھ سوچنا ہے جب

کچھ انٹرورسٹی بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے بارے میں

(شمس مہدی)

ہماری یونیورسٹی پچھلے کئی سالوں سے انٹرورسٹی ٹورنامنٹ کرانے میں کافی فراخدلی کا ثبوت دے رہی ہے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں یہاں Athelets meet اور ہاکی ٹورنامنٹ ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ٹینس کے ٹورنامنٹ ہوئے اور اس سال بیڈمنٹن کے ہوئے ہیں۔ یہ خوشگوار علامت ہے کہ لگاتار یہاں کئی ایک ٹورنامنٹ ہوئے۔ لیکن اس سے ایک ذمہ داری ہم پر آتی ہے اور وہ ہے خوش سلیقگی سے اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کی ذمہ داری۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس سال بیڈمنٹن ٹورنامنٹ میں کئی ایک ایسی بدعنوانیاں دیکھنے میں آئیں جو ہمارے شایان شان نہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی کی ٹیم ٹورنامنٹ کے آغاز میں ہی بقول شخصے "دھل گئی" اور ہماری یونیورسٹی کی لیڈیز ٹیم کا کھیل بہت دلچسپ ثابت ہوا۔ اسلئے کہ مضحکہ خیز حد تک معمولی تھا۔

اس انٹرورسٹی کے سلسلے میں اگر چند باتوں کا ذکر کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یونیورسٹی کی طرف سے بارہ سو روپیہ منظور کئے گئے تھے لیکن ایمپائر حضرات نے کھلاڑیوں کو Shuttle Cock دینے میں اکثر جس بخل سے کام لیا وہ کھلاڑیوں کے لئے پریشان کن ضرور تھا۔

ٹورنامنٹ کے منتظمین کو غالباً اس کا علم نہیں تھا کہ ہماری یونیورسٹی میں طلباء کی تعداد ۴ ہزار سے اوپر ہے اور سب ہی طلباء اس قسم کے میچوں کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں جبکہ سرسید ہال میں چار سو سے زائد تماشائی نہیں سما سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلا ناغہ ہر روز سرسید ہال کے اندر اور باہر میدان کارزار کا نقشہ نظر آتا تھا اور اس پر طرہ یہ کہ والنٹیروں کی اکثریت وی۔ ایم ہال سے تعلق رکھتی تھی جنکا برتاؤ انتہائی حد تک غیر مناسب تھا معلوم نہیں کیوں سارا کام وی۔ ایم ہال کے سپرد کیا گیا۔ ان والنٹیروں کے برتاؤ سے اکثر تو ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ یہ انٹرورسٹی ٹورنامنٹ نہیں ہے بلکہ وی۔ ایم۔ ہال کا انٹرہوسٹل ٹورنامنٹ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہال کی گیلری اکثر و بیشتر وی ایم ہال کے طلباء سے بھری رہتی تھی اور اکثر ایسا ہوا کہ دوسرے ہال کے لوگوں کو گیلری میں سے زبردستی نیچے اتار دیا گیا۔ یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے جسکی طرف ارباب حل و عقد نے قطعی توجہ نہیں دی

ایک بات اور بھی تعجب خیز ہے، بیڈمنٹن ابھی تک ہماری یونیورسٹی میں Gymnasium کے ضمن میں آتا ہے ——— ظاہر ہے علیحدہ کلب نہ ہونے کی وجہ سے اس پر پورا زور صرف نہیں ہو رہا یہی وجہ ہے کہ ہماری ٹیم کا مظاہرہ بڑا بُرا رہا۔ اگر ہماری ٹیم اس قابل نہ تھی کہ انٹرورسٹی میں اچھا کھیل سکے تو پھر ٹورنامنٹ میں شرکت کرکے خواہ مخواہ جگ ہنسائی کرانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

کھیل کے میدان سے

(تقی امام)

بیڈمنٹن کی انٹرورسٹی نے اسپورٹ کے شائقین کے لئے کافی حد تک دلچسپی کا سامان مہیا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ بدانتظامیوں کی وجہ سے بہت سے طالب علم کھیل نہ دیکھ سکے۔ منتظمین میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جنکا مقصد سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا کہ اپنے بغیر ٹکٹ کے دوستوں کو ہال میں داخل کیا جائے اور انھیں بیٹھنے کی مناسب جگہ بھی دلائی جائے۔ اکثر ایسا ہوا کہ جن طالب علموں کو پاس دئے گئے تھے وہ ہال کے باہر طواف کرتے نظر آئے اور دوسرے میچ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ موقع تمام لوگوں کو ملنا چاہئے تھا۔

اس کھیل کے متعلق چند باتیں قابل ذکر ہیں:—

پنجاب نے آگرہ کو ہرا کر نارتھ زون فائنل جیت لیا۔ ساؤتھ زون سے بمبئی یونیورسٹی کی Strong Contigent آئی جسمیں ہندوستان کے مشہور کھلاڑی نند و نیٹکر بھی تھے۔ ۲۹ نومبر کو Inter Zonal فائنل ہوا۔ پنجاب والوں کی بمبئی کے سامنے ایک بھی نہیں چلی اور وہ تمام میچ بلا کسی قابل ذکر مقابلہ کے ہار گئے۔ چونکہ مقابلہ زبردست نہیں تھا اسلئے نند و نیٹکر اپنے کھیل کا وہ مظاہرہ نہ کر سکا جو اسے ہندوستان بھر میں امتیازی حیثیت بخشتا ہے۔ بہرحال ہم تمام لوگوں کے لئے یہ ایک زریں موقع تھا۔ پنجاب کو یہ بہت بڑا Consolation رہا کہ اسکی لڑکیوں نے بمبئی کی لڑکیوں کو شکست دیدی۔ اور اس طرح Women's Champion Ship پنجاب کو ملی۔

اس انٹرورسٹی کا جائزہ لینے کے بعد تین باتیں کبھی نہیں بھلائی جا سکیں گی۔

(۱) نیٹکر (بمبئی)، نکربی (آگرہ)، مانی (الہ آباد) اور محمد ہاشم (علی گڑھ) کا کھیل برابر شاندار رہا۔

(۲) منتظمین کی نا اہلی اقربا پروری اور اسکے نتیجہ میں عام طلباء کی بے چینی اور

(۳) علی گڑھ کی قابل یادگار شکست۔

---

۳۰ نومبر کو ایس ایس ہال بیڈمنٹن کلب کے زیر اہتمام ایک شو میچ ہوا۔ جسمیں نند و نیٹکر، ڈیورس، احترام عالم خاں اور عثمان او نجی نے حصہ لیا۔ انتظام بہت اچھا تھا لیکن کورٹ میں پھسلن بہت زیادہ تھی جسکی وجہ سے بیڈمنٹن سے زیادہ اسکیٹنگ شو معلوم ہو رہا تھا۔

ہماری یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم یو پی انٹرورسٹی میں حصہ لینے لکھنؤ گئی۔ مقابلہ آگرہ یونیورسٹی ٹیم سے ہوا۔ علی گڑھ ایک اننگ سے ہار گیا۔ علی گڑھ کا شو بہت خراب رہا۔ اور یہ ایک ایسی علامت ہے جو آئندہ آنے والی شاندار ناکامی کا پتہ دیتی ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ کلب کے صدر اور کپتان صاحب بذات خود کچھ بھی کر سکیں گے۔ پتہ نہیں ہی۔ کے نائیڈو نے کیا کچھ سکھایا اور علی گڑھ والے کیا کچھ سیکھے۔

آخر نومبر میں ہماری ہاکی ٹیم کا یونیورسٹی گراؤنڈ پر یو پی پولیس کی ٹیم سے ایک میچ ہوا۔ جسے ہماری ٹیم نے تین گولوں سے ہرا دیا ہے۔ یہ ایک شگون نیک ہے۔ امید ہے کہ ہماری ٹیم آئندہ انٹر یونیورسٹی میں اپنی کھیل روایات کو برقرار رکھے گی۔